OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

"خدا کی بستی" اور "نیلی بار" میں "کارنیوال" کی صورت حال کا تقابلی جائزہ

A Comparative Analysis of Condition of "Carnival" in "*Khudā Kī Bastī*" and "*Nīlī Bār*"

Waqar Ahmad
Doctoral Candidate Urdu, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad
Dr. Arshad Mahmood Asif (Arshad Meraj)
Assistant Professor of Urdu, International Islamic University, Islamabad

Abstract

Mikhail Bakhtin is one of the most influential literary critics of 20th century. He was the Russian Formalist. *Bakhtin's* idea of dialogue an authority is rooted in the Medieval. Carnivals were unusual events which were completely against the daily life. In these events, there was a confusion of status. The power classes of the society were ignored in these carnivals. *Bakhtin* lists the stylistic features into which the "unity" of the novel is usually divided, direct authorial narration, stylization of everyday speech, stylization of semi-literary discourse such as letters and diaries, various types of speech such as moral philosophical scientific statements and the individualized speech of characters.

Keywords: Carnivals, "*Khudā Kī Bastī*", "*Nīlī Bār*", Comparative

تمہید

انقلاب روس نے جہاں زندگی کے ہر میدان کو متاثر کیا وہیں ادب کے نئے معیارات بھی لکھے گئے۔ اگست 1934ء جب روس کے ادیبوں کا اجلاس بلایا گیا تو اس میں سماج کے اندر پائے جانے والے بنیادی مسائل کی بات کی گئی جس میں سماجی حقیقت نگاری، خارجی حقیقت نگاری کو اشتراکی حقیقت نگاری قرار دیا گیا۔ یہی وہ بنیادی مسائل تھے، جن کی بنیاد پر ہیئت پسندوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور ان کو پابندی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو رُوسی ہیئت پسند گروہ کا نام دیا گیا۔ یہ لوگ اصل میں

CC BY

جنگ سے نفرت کرتے تھے اور ان کا مقصد جنگ سے تباہ حال معاشرے کے لیے ادبی فعالیت کی بنیاد پر مرحم لگانا تھا۔ یہ لوگ ادب میں موجود مخفی چیزوں سے پردہ کشائی کر کے نئی دنیا کی سیر کرانا اور زبان میں موجود روزمرہ سے آشنائی کرانا چاہتے تھے، تا کہ ادب کے نئے خدوخال روشن ہو سکیں۔ یہ صرف صوتی ساخت کے اعجاز ہی سے ممکن ہے۔ روسی ہیئت پسند متن کی جراہی کر کے اس میں موجود لسانی ساختیں اور لسانی خدوخال واضح کر رہے تھے۔ رامن سیلڈن Raman Selden ا "Contemporary Literary Theory" میں اور پیٹر ویڈوسن Peter Widdowson میں اس طرح لکھتے ہیں:

"Their approach despite the emphasis on close reading of texts, remained fundamentally humanistic[1]"

روسی ہیئت پسند اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ خصوصیات جو متن میں موجود ہوتی ہیں ان کی تفہیم اسی وقت ہی ممکن ہے جب آپ کسی فن پارے کے باطن میں اتریں گے تب جا کر قاری اس نوعیت پر پہنچے گا جہاں مسرتی عناصر کا جہاں آباد ہوتا ہے۔ وکٹر ارلچ Victor Erlich اپنی کتاب Russian Formalism میں لکھتے ہیں:

"Russian Formalism appears as one of the most vigorous manifestations of the recent trend toward close analysis of literature and art.[2]"

روسی ادب کو دیکھا جائے تو بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اس عہد میں روسی ہیئت پسندوں کے ساتھ ساتھ میخائل باختین اپنی الگ بزم سجائے نظر آتے ہیں۔ میخائل باختین اور اس کے ساتھی باختین سرکل کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ باختین سرکل میں گنتی کے چند لوگ شامل تھے جو مارکسزم اور ہیئت پسندی کے درمیان رہ کر تنقیدی نگارشات پیش کر رہے تھے انہیں بھی سیاسی عتاب کا نشانہ بنایا گیا جو کہ بہر حال وقت کا تقاضا تھا۔ ان کو گرفتار بھی کیا گیا اور جلاوطن بھی کیا گیا۔ وقت گزرنے کے بعد جب ان کے تحقیقی اور تنقیدی کام پر توجہ دی گئی تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ دراصل یہ لوگ ہی روس کے تنقیدی دماغ تھے۔ باختین سرکل میں Pavel Medede، Valentine Voloshinov اور Mikhail Baktins جیسے افراد شامل تھے۔ یہ گروپ 1918ء میں ترتیب دیا گیا جو 1924ء میں لینن گراڈ (سینٹ پیٹرزبرگ) چلے گئے اور وہیں یہ لوگ اپنا کام کرتے رہے۔ سٹالزم جب برسر اقتدار آیا تو سویت یونین کے ساتھ یہ گروپ 1929ء کے اواخر میں اس وقت ٹوٹ گیا جب متعدد ممبران کو فارغ کر دیا گیا۔ وولیو شینوف 1936ء میں مر گیا اور میڈویڈف 1938ء میں سٹالن کا شکار بنا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ ان دونوں کی منسوب تحریروں پر گمان ہوتا ہے کہ انہیں میخائل باختین نے لکھا ہوا ہے۔

پاول میڈویڈف کی تنقیدی سوچ کا آغاز

باختین سرکل میں موجود پاول میڈویڈف pavel Medvedev نے اپنی تنقیدی سوچ کا آغاز مارکسزم سے کیا۔ پاول میڈویڈف کے the formal Method in Literary Scholarship اور A critical introduction to social poetics جیسے مضامین میں ان کی فکری آرائیں سامنے آتی ہیں۔ یہ مضامین ہیئت پسندوں کے تصورات کے برعکس تھے۔ جب کہ ولنٹین وولوشینوف Valntin Voloshinov اس بات کا قائل تھا کہ ادب میں موجود زبان کو کسی صورت بھی آئیڈیالوجی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے فکری تصورات کو Marxisam and the philosophy of

language جیسے مضمون میں دکھائی دیتے ہیں ہے۔ وولیوشینوف کہتا ہے کہ زبان معاشرتی طرز زندگی اور سماجی تعلقات کے زیر اثر ہوتی ہے۔ رامن سیلڈن اپنی کتاب Contemporary literary theory میں اس طرح لکھتے ہیں:

"As voloshinov put it, consciousness itself can arise and become a viable fact only in the material embodiment of signs, language a socially constructed sign-system, is itself a material reality."(3)

زبان اور سماجی محرکات

باختین سرکل میں شامل لوگ زبان کو سماجی محرکات کا عکس بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں زبان کو کسی صورت بھی آئیڈیالوجی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ زبان سماجی اور سیاسی تال میل کے ساتھ مسلسل اپنے ارتقاء میں رہتے ہوئے کام کرتی ہے۔ یہ لوگ مارکسزم اور روسی ہیت پسندی کے درمیان حائل خلیج کو دور کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تحریروں سے پہلے فن پاروں میں موجود سماجی لوازمات اور سیاسی محرکات کے موضوع شدت اختیار کر چکے تھے۔ وولیوشینوف نے سماجی تال میل کی دوریاں ختم کرنے کے لیے خلاصہ معروضیت Abstract objectism اور انفرادی سبجیکٹوزم Individualistic Subjectivism کی اصطلاحیں متعارف کرائیں۔ فریب نظر ہے سکون و ثبات کو جب سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ بھی متحرک سماجی علامات ہیں۔ ان کے معانی اور مفاہیم ہر عہد اور قاری کے لیے مختلف معانی فراہم کرتے ہیں۔ یہ تکلمی اور مکالماتی انداز میں منظم کیے جاتے ہیں۔ جبکہ انتظامی ڈھانچہ ان کے معانی اور علامات کو محدود کرتا ہے جس کی بنیاد پر ان کی علامات اس صورت میں ظاہر نہیں ہو پاتیں جس طرح وہ آزادانہ اپنے معانی معاشرے میں رائج کرتیں ہیں۔ اور یہی صورت حال بدامنی کی جانب لے جاتی ہے۔ الفاظ کے معانی کی جدوجہد اور طبقاتی جدوجہد آپس میں جاری رہتی ہے۔ رامن سیلڈن Raman selden اپنی کتاب A readers Guide to Contemporary میں الفاظ کے معانی کو اس طرح لکھتے ہیں:

"The Bakhtin School was not interested in abstract linguistics of the kind which later formed the basis of structuralism. They were concerned with language as a social phenomenon. Voloshinovs central insight was that words (the Russian slove understood as discourse or litterance) are active dynamic social sign capable of taking a different meanings and connotations for different social classes in different social and historical situations."(4)

باختین سکول کے لوگ Signifier اور Signified کے مابین تعلق کو توڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس سے معانی سماجی بنیاد کی دلیل بن جاتا ہے اور یہ حکمران طبقے اور سماجی طبقے کے درمیان جدوجہد کا میدان بنا رہتا ہے۔ سماجی سطح پر طرح طرح کی بولیاں اور آوازیں موجود ہوتی ہیں۔ ایک فرد یہ تمام الفاظ اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ خود بھی یک طرفہ نہیں رہتا بلکہ ایک مرکب بن جاتا ہے۔ یعنی فرد لسانی اعتبار سے مفرد نہیں مرکب ہے۔ اسی طرح ایک فن پارہ لسانی اعتبار سے مرکب

ہوتا ہے جس طرح ایک فرد لسانی اعتبار سے مرکب ہوتا ہے۔ اس کو سماجی ڈھانچے سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں ثقافتی اعتبار سے معانی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں اور یہ ہمیشہ الجھاؤ کا شکار رہتے ہیں۔

مابعد ہیئت پسندی اور سٹرکچرازم سے تضاد

باختین سرکل کے افراد نے جو بھی لکھا وہ مابعد ہیئت پسندی اور سٹرکچرازم کے برعکس تھیں۔ وہ لوگ نامونوسیت (اجنبیانے کا عمل) کے بھی خلاف تھے اور اس کو غیر ضروری عمل قرار دیتے ہیں۔ جب کہ وولیوشینوف اور میڈویڈیف کے نظریات جو بعد میں میخائل باختین کی کتابوں میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی وضاحت کو میخائل باختین کی کتابوں سے تلاشا جا سکتا ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں اس کی محنت رنگ لائی اور نفرت کے بادل چھٹ گئے آخر کار میخائل باختین کو دوبارہ روس بلایا گیا جہاں اس نے زندگی کے باقی ماندہ ایام گزارے اور اس کو لینن کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ باختین بیسویں صدی کے اہم نقادوں میں نمائیاں مقام کے حامل ہیں۔ باختین دراصل ان بولیوں اور لہجوں کے بارے میں اپنی شناخت بناتے ہیں جو ادب میں ادبیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بولیاں ہی ہوتی ہیں جو اقتدار کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں اور لوگوں کو صحیح جمہوریت کی بصیرت عطا کرتی ہیں۔ باختین کا مسئلہ زبان اور اس کا عملی کردار ہے۔ وہ کارل مارکس اور سوسیئر کو بھی اپنے موضوعات کا حصہ بناتا ہے اور ان کے تصورات سے عقیدت کا اظہار اس قدر نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ سوسیئر کا سارا زور محض زبان کے رسمی پہلوؤں پر ہوتا ہے جب کہ زبان کو سماجی تفاعل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالعزیز ملک، "روسی ہیئت پسندی تعارف اور تفہیم" میں اس طرح لکھتے ہیں:

> "باختین نے اپنی توجہ زبان کے سماجی اور طبقاتی کردار پر کم اور اس بات پر زیادہ مرکوز کی کہ زبان ہی اقتدار کا قلع قمع کرتی ہے اور متبادل آوازوں (Alternate Voices) کو سامنے لاتی ہے۔ اس نے کارل مارکس کی طرح بیان (Utferance) کی سماجی توضیح کی۔ یوں اس نے تاریخی مادیت سے اپنا فکری تعلق جوڑ لیا۔"(5)

شاعری پر تنقید

میخائل باختن ناول کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی ہدف تنقید بناتا ہے اور کہتا ہے کہ شاعری میں آمریت چھلکتی ہے۔ اس میں فرد واحد کی زبان ہوتی اور یہ صرف مخصوص طبقے میں پسند کی جاتی ہے۔ شاعر صرف واہ واہ کا طلب گار ہوتا ہے۔ شاعری اشرافیہ طبقہ کی لگژری ہے۔ یہ مرکز مائل طاقتوں کے زیرِ اثر پروان چڑھتی ہے اگر ناول کو دیکھا جائے تو اس میں جمہوریت جھلکتی ہے جو غریب اور پسماندہ طبقے کی ترجمانی کرتی ہے۔ ناول ہمیشہ مرکز کے ساتھ تصادم میں رہتا ہے اس بنیاد پر یہ مرکز گریز بن جاتا ہے۔ باختین کے مطابق ناول کے ڈسکورس کو سمجھنے کے لیے ناول کے سماجی سیاق کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سماجی سیاق کے زیر اثر ناول کا لسانی مزاج متشکل ہوتا ہے اور مواد کے ساتھ فارم کا تعین کیا جاتا ہے۔ باختین سرکل کے تصورات میں کارنیوال (Cornival) کا نظریہ کافی دلچسپ ہے۔ میخائل باختین میلوں ٹھیلوں کی بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب یہ میلے لگتے ہیں تو دور دراز سے افراد اس میں جمع ہوتے ہیں ان کی ثقافت، رہن سہن اور زبان جدا ہوتی ہے اور یہ اپنی مرضی سے اس میں لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں بھانت بھانت کی آوازیں سننے کو ملتی ہیں۔ افراد کے درمیان حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہاں ان کو ذمہ داریاں بھول جاتی ہیں۔ یہ لوگ آزادی کی فضا میں سانس لیتے اور اپنی مرضی سے لطف اندوزی حاصل

کرتے ہیں۔ اس میں اقتدار کی سب سطحیں الٹ جاتیں۔ حکمران اشرافیہ اور پسماندہ طبقے آپس میں گھل مل جاتے اور زبان کا آزادانہ استعمال کرتے۔ عام سماجی سطح پر جن چیزوں کا ملاپ ممکن نہ ہو میلے ٹھیلے میں یہ ملاپ ممکن ہو جاتا ہے۔ میخائل باختین ایسے مناظر کو ادب پر بھی لاگو کرتا ہے۔ کارنیوال کے تصورات (The Dialogic Imagination) میں تفصیلاً ملتے ہیں۔ جو اس نے دوستووسکی پر تحقیقی اور تنقیدی صورت میں لکھی ہے۔ گوپی چند نارنگ ساختیات اور پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں کارنیوال کو اس طرح بیان کرتے ہیں: "کارنیوال سے مراد (قصبائی میلے ٹھیلے) کا نظریہ ہے اور باختین جس طرح ادب کی تاریخ اور ادبی اصناف پر اس کا اطلاق کرتا ہے وہ خاصا دلچسپ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کارنیوال کھیل تماشے اور موج میلے کا موقع ہوتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں اجتماعی اور عوامی ہوتی ہیں۔ جن میں سب شریک ہوتے ہیں۔ یہاں سماجی شان و شوکت اور اقتدار کی تمام سطحیں الٹ جاتی ہیں۔ (بے وقوف عقل مند بن جاتے ہیں اور بادشاہ بھک منگے) یہ ہماری عام سماجی زندگی میں جن چیزوں کا میل نہیں ہو سکتا وہ یہاں خلط ملط ہو جاتی ہے۔ ٹھوس دنیا کی حقیقیتں اور فینٹسی کی خیالی باتیں، جنت و جہنم، مقدس وغیر مقدس، پاک و ناپاک، ثواب و عذاب، زاہد مرتاض اور رند شاہد باز سب تماشے کی ایک ہی سطح پر ملتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو مقتدر، سنجیدہ اور سخت گیر ہے طاقت، جبر اور احتساب کا مظہر ہے۔ کارنیوال میں اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔"(6)

مصنف ناول میں ایسی زبان استعمال کرتا ہے جو قاری کے ذہن کی بالیدگی کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے۔ ناول کردار کے ساتھ ساتھ جن طبقات کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے، ان کے ذوآوازی (dialectical) ٹکراؤ کو پیش کرنے کا عمل ہے۔ بل کہ نظریاتی نقطہ نظر کا مناظرہ بھی پیش کرتا ہے۔ ناول میں مصنف سماجی بولیوں کی فنکارانہ تصویر تخلیق کرنے کے لیے شعوری کوشش کرتا ہے۔ ناول کے کردار اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اپنی مرضی سے زندگی کے امور سرانجام دیتے ہیں۔ جن سے ان کے ذہنی رجحانات کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ مصنف ان کی اپنی اور حقیقی روزمرہ کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ میخائل باختین نے اس بات کا اظہار دوستووسکی اور ٹالسٹائی کے ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا۔ دوستووسکی کی ناول نگاری کا فن آزادی اظہار کے حوالے سے معراج کو چھوتا ہے، جب کہ ٹالسٹائی کے کرداروں پر بے جا قدغن لگائی جاتی ہے۔ اور وہ کھل کر زندگی جینے سے عاری دکھائی دیتے ہیں اور اس طرح کے ناول میں کردار مصنف کے نظریے کو پروان چڑھاتے ہیں۔ احمد سہیل نے اپنے مضمون "باختین کا دبستان" میں کثیر الاصواتی ناول کے بارے میں یوں لکھا ہے: "اس نے اس بات پر زیادہ زور نہیں دیا کہ متن معاشرے یا طبقات کی دلچسپی کی عکاسی کرتا ہے مگر یہ ضرور کہا کہ زبان بعض دفعہ اقتدار کو انتشار سے بھی دوچار کر دیتی ہے اور زبان (آواز) کے متبادل آزادانہ اور خود مختار سفر کے لیے راہیں کھولتی ہیں۔"(7)

حس مزاح

"Rabelais" میں باختین نے حسن مزاح کے ذریعے طاقت کے ساتھ کھیل کھیلا تھا۔ اس میں باختین نے قرون وسطیٰ کی دنیا کی ایک واضح تصویر پیش کی تھی۔ اس میں غیر سرکاری دنیا کو حس مزاح کے ذریعے سرکاری ثقافت، خوف اور عقیدہ کو فتح کیا تھا۔ اس میں انہوں نے کارنیوال کی تمام خصوصیات کے ذریعے ریاست کو حرف تنقید بنایا۔ طنزیہ ہنسی، شعور، بازاری زبان، موروثی روایات، مروجہ سچائی سے آزادی کا جشن دکھایا تھا۔ ظاہر ہے، پر سب باتیں سرکاری روایات کے خلاف جاتی تھیں، Michael Mayerfeld Bell اپنی کتاب Environmental Sociology میں اس موضوع پر اس طرح لکھتے ہیں:

"Bakhtin based his argument on an unusual source: the quality of humor in the writings of the early French renaissance writer, Francois Rabelais, "The novels of Rabelais are infamous for their scatological staire of French politics of the sixteenth century."(8)

کارنیوال کے مطابق ناول کا مطالعہ انتہائی دلچسپ انداز میں سامنے آتا ہے۔اور یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہے۔ایک ناول کو جتنی بار پڑھیں گے نئے نئے پہلو سامنے آتے چلے جائیں گے۔ان میں سماجی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور مذہبی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام پہلو موجود ہوتے ہیں ۔ کارنیوال کے مطابق زبان اور لہجے کا بدلنا ایک قدرتی امر ہے۔زیرِ بحث ناولوں میں یہ موضوعات اس وقت کھل کر سامنے آتے ہیں جب کردار ان کے اوپر کھل کر تنقید کرتے ہیں ان کے باطن اور ظاہر پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہوتا وہ معاشرے میں موجود تمام حقائق کی گرہ کشائی کرتے چلے جاتے ہیں ۔یہ کردار کسی کو بھی معاف نہیں کرتے۔انسانی تاریخ کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ازل سے انسان پیٹ کی ضروریات کو پورا کرنے میں جتا ہے یہ بھوک اور افلاس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے ۔پہلے انسانی آبادی کم تھی اور خوراک وافر مقدار میں موجود تھی جب سے انڈسٹریل ازم نے دنیا کو جکڑا ہے بھوک اور افلاس میں کمی ہونے کی بجائے اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔اب ترقی یافتہ عہد کی بات کی جائے تو سرمایہ درانہ نظام میں ذخیرہ اندوزی نے اس کو تقویت فراہم کی غریب غریب سے غریب تر جبکہ امیر افراد کا سرمایہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔اوپر سے انصاف اور امن کی غیر یقینی صورت حال نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے۔ناول سماجی سطح پر زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ناول میں محبت کے لطیف جذبات سامنے آتے ہیں وہیں عصری مسائل بھی ابھرتے دکھائی دیتے ہیں "خدا کی بستی" شوکت صدیقی کا ایک کامیاب ناول ہے اس میں انہوں نے کراچی شہر میں آوارہ لڑکوں کی مجالس جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر اپنی بقا کی جنگ لڑتے نظر آتے ہیں ان کے مسائل کو شاندار انداز میں تحریر کیا ہے۔شوکت صدیقی کی پیدائش تو لکھنؤ میں ہوئی تقسیم کے وقت ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا اور کراچی میں قیام پذیر ہوا۔انہوں نے وہاں کے حالات کو خدا کی بستی میں اس طرح بیان کیا کہ جب بھی اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے قاری انہیں گلی محلوں میں کھو جاتا ہے۔ کارنیوال کے مطابق دیکھا جائے تو کرداروں کی زبانی وہ تمام مسائل سامنے آتے ہیں جو آزادی اظہار کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ناول کا ایک کردار راجہ جو کہ ایک بھکاری کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ایک گاڑی والا جب اس کو بھیک نہیں دیتا اور اس کو نصیحت کرتا ہے تو راجہ جس بوڑھے کو ریڑھی میں کھینچ رہا ہوتا ہے وہ اس کے بارے میں اس طرح کہتا ہے:

> "جب کار آگے بڑھ گئی تو بوڑھے کوڑھی نے گندی سی گالی دے کر راجہ سے کہا۔
> سالے نے پیسہ ایک نہیں دیا۔ نصیحت ڈھیر بھر کر دی۔اب اس مرغی کے جنے سے پوچھو کہ خالی نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ دھت تیرے۔ گداگر نے پھر گالی دی۔"(9)

پسماندہ طبقے کی ترجمانی

جب سے ادب لکھا جانے لگا نچلے اور پسماندہ طبقے کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت موجود رہی ہاں البتہ ادیبوں کے انداز بدلتے چلے گئے۔جہاں کہیں بھی ان کے حقوق کی بات کی گئی ہمیشہ ان کو کمزور اور لاچار کے روپ میں ہی پیش کیا گیا۔ان کی کسمپرسی کو

معاشرے کے اوپر ایک بد نما داغ کے طور پر ہی لیا گیا۔ ہر جگہ ان کی تذلیل ہوتی رہی۔ ان کو معاشرے میں وہ مقام نہ دیا گیا جس کے در اصل یہ لوگ حقدار ہیں۔ اشرافیہ ان کے بل بوتے پر زندگی کی جنگ میں جو نمائیاں دکھائی دیتے ہیں ان کی محنت ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اپنی بقاء کی جنگ لڑتا نظر آتا ہے۔ یہ لوگ نوابوں، زمینداروں اور راجاؤں کے ہاں نسل در نسل غلامی کی زندگی گزار دیتے ہیں اور ان کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دیتے۔ خود تو یہ لوگ روکھا سوکھا کھا لیتے ہیں مگر ان کے مالکوں کے ہاں طرح طرح کے پکوان بنائے جاتے ہیں اور یہ کھانے ان لوگوں کو دیکھنے بھی نصیب نہیں ہوتے۔ اس محروم طبقے کو ہمیشہ احساسِ محرومی میں رکھا جاتا ہے تاکہ یہ لوگ بغاوت نہ کر دیں۔ "نیلی بار" طاہرہ اقبال کا ایک شاندار ناول ہے اس میں دوآبہ رچنا کے باسیوں کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ناول اس عہد کی عکاسی کرتا ہے جب یہاں کے مقامی افراد کا ذریعہ معاش صرف مال مویشی تھے ان کی زندگی کی جمع پونجی یہ ڈھور ڈنگر ہی تھے۔ قانون کی عمل داری صرف زمین داروں کے ہاتھ میں تھی سب افراد ان کی عقیدت کا دم بھرتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے اپنے قوانین تھے۔ یہ لوگ راوی اور چناب کے درمیان مال مویشی چراتے تھے۔ جو زیادہ تر نمبر داروں ذیلداروں کے ہوتے۔ ایک وقت میں جب بارات سے لڑکیاں اغواہ کر لی جاتی ہیں اور ان کے لواحقین ان کی واپسی کا مطالبہ لیکر ذیلدار کے پاس آتے ہیں تو اس صورت حال کو اسطرح بیان کیا جاتا ہے:" وہ خود تو ظلم اور زبردستی کے قائل نہ تھے لیکن نظام قدرت کے توازن کے لیے کمزور، غریب اور زیر دستوں کی اوقات اور حد بندی کے لیے انھیں طاقت ور کے خوف کا شکار رکھنا بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان ناداروں کی کمینوں کا بھر اپیٹ بڑا فساد ہے"(10)

انسان چاہے جتنی بھی کوشش کر لیے اس ماحول سے نہیں نکل سکتا۔ معاشرتی ناہمواریاں انسان کے ساتھ ہمیشہ چمٹی رہتی ہیں وہ کبھی کبھی ان حالات کے آگے بے بس ہو جاتا ہے اور ان کو ہی اپنا مقدر سمجھ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ راجا اور اس کی والدہ بے یارو مددگار تقسیم کے وقت پاکستان میں بشیر نام کے آدمی کے ساتھ آتے ہیں۔ بشیر راجا پر بہت ظلم کرتا ہے اور اس کو جان سے مار ڈالنے پر تلا رہتا ہے۔ ایک دن اس کی والدہ اس کو یتیم خانے میں چھوڑ آتی ہے۔ یتیم خانے کے ملازمین بظاہر تو مسلمان دکھائی دیتے ہیں مگر کام کے لحاظ سے انتہائی گرے ہوئے افراد تھے۔ یتیم خانے میں بھی اس کو سکون کی زندگی نصیب نہ ہو سکی۔ والدہ نے دوسری شادی کر لی اور اس کا شوہر اس سے طوائف کا کام شروع کروالیتا ہے۔ اُدھر راجا کو یتیم خانے کی طرف سے شہر میں بھیک مانگنے پر لگا دیا جاتا ہے۔ نوشا جب راجا سے ملتا ہے دونوں میں گہری دوستی ہوتی ہے اور وہ گھر کو چھوڑ کر کراچی بھاگ جاتے ہیں۔ نوشا راجا سے پوچھتا ہے تو وہ اس کو اس طرح بتاتا ہے۔ شوکت صدیقی اس صورت خال کو "خدا کی بستی" میں اس طرح لکھتا ہے:" یہ سالی بھیک مانگنے کی عادت وہیں سے پڑی ہے۔ وہاں ایک سالا ملاں تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ پر ایک نمبری تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ چھوٹا مہتمم تو ذرا اچھا تھا مگر بڑا بہت پاجی تھا۔ روزانہ شام کو معائنہ کرنے آتا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بید ہوتا۔ جو لڑکا پیسے کم لاتا بس اس کی شامت آجاتی۔ یار ایسی مار مارتا تھا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"(11)

اشرافیہ سے بغاوت اور اس کے نتائج

اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد جب مسلسل غریب اور پسماندہ طبقے کا استحصال کرتے رہتے ہیں تو کبھی کبھی بغاوت بھی سر اُٹھا لیتی ہے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے تمام سرکاری مشینری حرکت میں آجاتی ہے۔ بغاوت کرنے والوں کے خلاف طرح

طرح کے مقدمات بنائے جاتے ہیں اور ان کو جیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے ان کے رہنماؤں کو اذیتوں سے گزارا جاتا ہے تا کہ یہ لوگ اپنے خیالات سے منحرف ہو جائیں۔ بعض اوقات یہ رہنما اپنے مقاصد حاصل کر کے اس بغاوت سے علیحدہ بھی ہو جاتے ہیں اور غریب افراد کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا اور وہ کال کوٹھڑی میں بند اپنی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔ اشرافیہ طبقہ ان کے خوشحال ہونے کے بارے میں کئی طرح کے بلاجواز ہتھ کنڈے استعمال کرتے ہیں اور غریب اور پسماندہ طبقے کو مُلک کے دیوالیہ ہونے کا باعث قرار دے کر اپنی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اس کام میں سرکاری محافظ ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اشرافیہ پسماندہ طبقے کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے۔ شوکت صدیقی "خدا کی بستی" میں اس طرح لکھتے ہیں:

> "اگر ان غریبوں مزدوروں، کسانوں کو دولت اور اقتدار مل جائے تو یہ خاندانی دولت مندوں کی نسبت کہیں خطرناک ثابت ہوں گے کہیں اسفل، کمینے، فضول خرچ اتنے کہ دنوں میں کنگلے ہو جاہیں اور ملک کی اکانومی کو بھی ڈبو دیں"(12)

سرمایہ داروں کے سہولت کار

سرمایہ دار لوگ اپنے اقتدار کا وجود قائم رکھنے کے لیے ہر طرح سے ہیلے بہانے تراشتے ہیں اس مقصد کے لیے انہیں سیاسی ،مذہبی، معاشی اور سماجی سطح پر ایسے سہولت کار بھی مل جاتے ہیں جو ان کے مقاصد کی تکمیل میں جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں۔ جب ان کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں تو ان کو مکھن کے بال کی طرح ان کو نکال دیا جاتا ہے۔ یہ غریب اور پسماندہ افراد ہی ہوتے ہیں جو با آسانی ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں ان کو صرف ایک وقت کا کھانا درکار ہوتا ہے اس کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اشرافیہ کو ان سے ایسی ہی تعقعات درکار ہوتی ہیں اس سے بڑھ کر جب یہ لوگ سوچتے ہیں تو وہ ان کو نشان عبرت بنایا جاتا ہے۔ اشرافیہ طبقہ اپنے سرمائے کو پانی کی طرح بہاتا ہے تا کہ ووٹ کی طاقت سے اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہو سکیں۔ اسکائی لارک جو کہ پسماندہ طبقے کی فلاح کے لیے کام کرتے ہیں تا کہ پسماندہ طبقے کو بلند کیا جا سکے اسی کام کے سلسلے میں یہ لوگ ہسپتال کے لیے رقبہ حاصل کرتے ہیں جبکہ خان بہادر فرزند علی ایک سیاسی چال باز ہے وہ اسکائی لارکوں سے ہسپتال کی ادویات کے معاملے میں ڈیل کرتا ہے اور وہ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ خان بہادر ہسپتال کی زمین پر راتوں رات مسجد کی بنیادیں کھڑی کرا دیتا ہے اور اس کو اپنی سیاست میں استعمال کرتا ہے۔ ایک جلسے کے دوران اس کے کام کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے:۔

> "باری تعالیٰ نے ان کو دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ایک ایمان بھرا دل بھی عطا کیا ہے۔ ان ملعونوں کو دیکھئے جو ان پر طرح طرح لے الزام لگا کر بدنام کر رہے ہیں۔ اس مسجد کو شہید کرنے کے درپے ہیں۔ آپ ان کو بتا دیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ابھی باقی ہے۔ جان و مال کیا، ہم راہِ خدا میں سر بھی کٹا سکتے ہیں۔ سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرا سکتے ہیں۔"(13)

سرمایہ دار اور مذہب کا استعمال

سرمایہ پرست افراد کے ہاں مذہب نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جب ان لوگوں سے طبیعت کا حال پوچھا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اب ماشاءاللہ بارہ انے طبیعت میں فرق ہے۔ دنیا کے سارے معاملات کو دو جمع دو اور دو ضرب دو کے حساب سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے ہر کام سے اپنے بزنس کے فروغ کو حاصل رکھتے ہیں۔ مذہبی رسومات اور مذہبی عقائد ان کے ہاں کوئی معانی نہیں رکھتے۔ مذہب جو کہ انسان کا ایک حساس معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی مد میں یہ لوگ کروڑوں روپے عوام کی جیبوں سے

نکال رہی ہوتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ ان کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ سرمایہ دارنہ نظام کے حامل افراد جب سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو یہ مذہب کو بطور ڈھال استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد دراصل اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اس جگہ یہ لوگ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور سبھی قانون اپنے ہاتھ میں لے کر لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی مذہبی عمائدین ان کو اس سارے کھیل میں تقویت فراہم کرتے ہیں۔ اشرافیائی طبقہ ان کو بطور آلہ کار استعمال کرتے ہیں۔ "نیلی بار" میں مصنف اس صورت حال کو اس انداز میں بیان کرتی ہیں:

> "ہر عبادت، ہر قربانی میں منافع بخش کاروبار کا موقع کتنی سہولت سے نکل آتا ہے۔ حج کا بزنس، رمضان کا بزنس، محرم و عاشورہ کا بزنس، میلاد کا بزنس، شبینے اور نعت خوانی کا بزنس، پیری مریدی، درگاہیں مزار، تعویز گنڈے دم درود، فال کتاب نذر نیاز۔ دنیا کا ہر مذہب اپنے خاص بندوں کے معاش کا کتنی فارغ البالی سے اہتمام کر دیتا ہے جیسے یہ سیاست کا بزنس اشرافیہ کا کھیل بن جاتا ہے۔۔۔"(14)

میخائل ناختین نے جب ناول نگاری کے تصورات پیش کیے تو اس وقت ان کے اس کام کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی کام کی جانب توجہ کی گئی تو اس کے تصورات اپنی نوعیت کے الگ تصورات تھے۔ باختین نے ناول نگاری کے ادب پر کام کیا تھا اور ایسے تصورات پیش کیے جن کی بنیاد پر ناول کے اندر موجود جمہوری رویوں کو پرکھا جا سکتا تھا۔ یہ تصورات کسی بھی ناول میں موجود اس بغاوت کو منظر عام کرتے ہیں جو اشرافیائی طبقے کی جانب سے پسماندہ طبقے پر مسلط کی جاتی ہے۔ کارنیوال باختین کا ایک اہم تصور ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی ناہمواری کو کرداروں کی مدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہ ناہمواری دراصل سرمایہ درانہ نظام کے خلاف ایک انقلاب کے طور پر جانی جاتی ہے۔ "خدا کی بستی" اور "نیلی بار" کا جائزہ لیا جائے تو دونوں ناول اپنے انداز میں مقامی طرز زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں گلی محلوں میں بولی جانے والی سادہ زبان کے مکالمے بھی شامل ہیں سادہ زندگی کے علاوہ رہن سہن بھی سادہ ان کی ضروریات زندگی بھی مختصر ہیں ایک وقت کی روٹی مل جائے تو یہ لوگ شکر کرتے ہیں۔ مگر جب بھی ان کو موقع ملتا ہے اپنے دل کی بھڑاس نکال دیتے ہیں۔ جس کی بدولت ان کے باطن کی تطہیر ہو جاتی ہے اور وہ دوبارہ زندگی کے سفر میں شامل ہو جاتے ہیں۔

کارنیوال کی مثال ایک میلے کی سی دی جاتی ہے جس میں تمام افراد اپنی اصل شناخت گم کر کے داخل ہوتے ہیں۔ میلے میں تمام افراد بغیر کسی دباؤ کے اپنی مرضی سے لطف حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ وہاں ایک دوسرے پر آوازیں کسیں جاتی ہیں اور ہر ایک پر کھل کر تنقید کی جاتی ہے۔ اس کی بدولت معاشرے میں موجود تمام ناہمواری ظاہر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے ایسے مسائل کا سینہ چاک کیا جاتا ہے جو ایک معمولاتی زندگی میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ میلے میں امیر غریب سب برابر دکھائی دیتے ہیں۔ اس جگہ پر مختلف زبانیں، رویے اور لہجے اس سماں کو مزید دلکش بناتے ہیں۔ باختین یہ بھی کہتا ہے کہ شاعری کی نسبت ناول میں جمہوری عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ شاعری صرف مخصوص طبقے کی ترجمان۔

خلاصۂ بحث

انگریزی ادب میں میخائل باختین کے تصورات کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیقی کام ہو رہا ہے جبکہ اردو ادب میں باختین کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ شوکت صدیقی اور طاہرہ اقبال کے ناولوں میں بہت سے جمہوری رویے موجود ہیں۔ خدا کی بستی میں ایسے بہت سے رویے ملتے ہیں جن کی بنیاد پر اس کا مطالعہ باختین کے تصورات کو سامنے رکھتے

ہوئے کیا جا سکتا ہے۔ بھوک ایک انسان کو معاشرتی آداب کا اندازہ نہیں کرنے دیتی۔ غریب اور پسماندہ افراد کو غیر اخلاقی کام کرنے کی جانب راغب کرنا، انشورنس کمپنیوں کی جانب سے افراد کی جانوں سے کھیلنے کا مکروہ دھندا، محافظ ہی جرائم کی پشت پناہی کرتے نظر آتے ہیں، لینڈ مافیا اور قبضہ مافیا کو اپنے ساتھ ملائے رکھنا، بحثیت قوم بے حسی، اسی طرح نیلی بار میں زرعی اصلاحات، حقوق نسواں سے عاری لوگ، غلام ابنِ غلام، استحصالی اوزار، انقلابی افراد کا دوسروں کی جانب دیکھنا۔ مفادات کے رشتے، معاشرتی بدلاؤ اور مذہبی اقدار، بیرونی تعلیم کے معاشرے پر اثرات، سماجی پستی، استعمار کے ہاتھوں خونی کھیل، ایسے بہت سے رویے ان ناولوں میں موجود ہیں جو در اصل مرکز گریز معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں معاشرتی، معاشی، سماجی اور مذہبی اقدار کی بنیاد پر عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ غریب اور پسماندہ افراد کے حصے کا رزق کھایا جاتا ہے۔ یہ تمام صورت حال کرداروں کی زبانی دکھائی جاتی ہے۔ معاشرتی ناہمواری کی جب بھی بات ہوتی ہے تو کرداروں کے لہجے کا بدلاؤ بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

References

[1]Raman Selden and Peter Widdowson, *Contemporary Literary Theory* (The University Press of Kentucky, third edition 1993) , 27.
[2]Victor Erlich, *Russian Formalism* (, New York: The Hague. Paris, 1980), 274.
[3]Raman Selden and other "contemporary litrary theory" P-38
[4] Selden and Widdowson, *Contemporary Literary Theory*, 29
[5]Abdul Aziz Malik, "Rusi Hait Pasandi:Ta'aaruf aur Tafheem," *Journal of Research, (Department of Urdu, Baha-ud-Din Zakriya University, Multan,) Shumara 33* (n.d):22
[6]Gopi Chand Narang, *Sakhtiyaat Pas e Sakhtiyaat aur Mashraqi Sheriyaat* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2010), 99.
[7]Ahmad Sohail, "Bakhtain ka Dabistan," Mashmoola: Shab Khoon, Shumara No.188, November 1995, 64
[8]Michael Mayerfeld Bell, Environmental sociology (Los Angeles: SAGA publications press, Ed-4, 2012), 158.
[9]Shaukat Siddiqui, *Khuda Ki Basti* (Karachi: Raktaab Publications, 2019), 21.
[10]Tahira Iqbal, *Neeli Baar*(Dost Publications, Islamabad, 2017),P52
[11]Shaukat Siddiqui, *Khuda Ki Basti*.
[12] Tahira Iqbal, *Neeli Baar*, 111.
[13]Shaukat Siddiqui, Khuda Ki Basti, 208.
[14]Tahira Iqbal, *Neeli Baar*, 302.